وثلاثۃ اشھر تسعۃ و	تیس تیس دن کے اور تین ماہ انتیس انتیس
عشرون یوما بالھلال ولا	دن کے ہوجاتے ہیں مگر یہ تسلسل اس سے
یتوالی اکثر من ذلک .	زیادہ نہیں رہتا۔
واما بالحساب فدائما	لیکن حساب کے اعتبار سے ہمیشہ ایک
شھر ثلاثون وشھر تسعۃ و	ماہ تیس دن کا ہوتا ہے اور دوسرا انتیس کا۔
عشرون لاتتغیر (ص ۱۷۱ طبع مصر ۱۳۷۹ھ)	اور اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ تقویم کا حساب اصطلاحی ماہ وسال پر مبنی ہے، اور مسلمانوں کا حساب حقیقی ماہ وسال پر۔ اس لیے ہر دن اور ہر تاریخ میں ان دونوں کا مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے اختلاف کی صورت میں بجائے اس کے کہ تقویم سے مؤرخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں کو جانچا جائے۔ علم ودانش کا تقاضا یہ ہے کہ خود مورخین کے بیان کردہ دنوں اور تاریخوں سے تقویم کو درست کرلیا جائے، کیونکہ مورخین اسلام نے اپنی تصانیف میں ہر دن کی وہی تاریخ لکھی ہے جو رؤیت ہلال کے لحاظ سے اس روز ان کے یہاں تھی، اور یہی تاریخ حقیقی تاریخ ہے، اور اسی کا شرع میں بہ نص قرآنی اعتبار ہے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کی بنا پر دیا ہے تو پھر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ بغیر ہلال کو دیکھے یا اس کی رؤیت کی شہادت گزرے محض اپنے حساب وکتاب کی بنا پر اس حق کو ان سے چھین لے اور اپنے اعلان کے ذریعے تعیین صیام وافطار پر مجبور کرے۔

ترجمہ:۔ از پروفیسر وائی ایس طاہر علی

شاہ عبداللطیفؒ بحیثیت ایک ترقی پسند شاعر

(سندھ پر عالمی مذاکرے میں پڑھا گیا۔)

افلاطون نے اپنے جمہوریہ میں شاعروں کو کوئی مقام نہیں دیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاعری کا کام صرف عکاسی کرنا ہے اور یہ مرحلہ نہایت صبر آزما اور ہمت شکن ہے، لیکن ارسطو نے واضح کیا کہ شاعری ایک مثبت اور دھماکہ خیز عمل ہے، جس کا سماج میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ ارسطو نے شاعری کو صرف آئینہ نہیں سمجھا بلکہ وہ اسے تبلیغی طاقت تصور کرتے تھے، وہ جانتے تھے کہ ادبیات سے انسان کے ضمیر کی تطہیر ہوتی ہے اور پھر اس سے ماحول والا معاشرہ بھی تبدیل ہونے لگتا ہے۔

بنا برایں ادبیات کا ایک ثقافتی مقصد ہوتا ہے اور سماج میں ادیب ایک ذمہ دار فرد ہے۔ جب یہ بات مسلم ہو چکی کہ ادبیات کا سماج کے ساتھ چولی دامن کا رشتہ ہے تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا ادیب قدامت پسند ہے جو معاشرے میں عداوت اور نفرت کے بیج بوتا ہے یا وہ اس کو صلح و آشتی کی طرف لے جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، آیا وہ اپنے ماحول کا صرف خاکہ کھینچتا ہے یا وہ اپنی زندگی میں کسی کارواں کا سالار بھی ہے۔

چنانچہ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ شاہ عبداللطیفؒ اس معیار پر کیسے اترتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر ہمیں قدامت پسندی اور ترقی پسندی کے مفہوم کو واضح کرنا ہی ہے۔

اگر ترقی پسندی کا مفہوم یہ لیا جائے کہ ہم تاریخ کو گروہ بندی کی نظر سے یا جماعتی کشمکش کی عینک سے دیکھیں یا اس کا سیاسی نقطۂ نظر سے یا مذہبی عقیدے سے جائزہ لیں تو پھر شاہ صاحب کسی زمرے میں نہیں آسکتے۔ لیکن اگر اس کا مفہوم یہ ہو کہ ادیب کا اپنے ماحول کے مسائل میں کیا حصہ ہے اور اپنے رسوم و روایات اور نظریات کے ساتھ اس کا کیا ردِ عمل ہے تو معاملہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

ہمیں ایک اور چیز کا بھی خیال رکھنا ہوگا، ہر سماج میں ایک ارتقائی مرحلے پر گروہ بندی نظر آتی ہے جو دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک حصہ محنت کشوں کا ہے اور دوسرا ذہنی کام کرنے والوں کا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ہنر اور ثقافت کے دو چشمے دوش بدوش بہنے لگتے ہیں ایک چشمہ عوامی ادب یعنی لوک فن کا ہوتا ہے، اس میں مزدوروں کی عرق ریزی اور بیدار مغزی کارفرما ہوتی ہے۔ اس کی داستان بھی بڑی طویل ہے جو لوک کہانیوں میں مضمر ہے۔ گورکی نے تو اس بارے میں یہاں تک کہا ہے کہ کوئی شخص تاریخ کا ماہر نہیں بن سکتا جب تک وہ ان لوک کہانیوں اور دنت کتھاؤں کو نہ پڑھے۔ ان سے تو بقول اس کے ادب اور سماج کے زوال و ارتقاء کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دوسرا چشمہ ہمیں تمدن و ثقافت کے عہد میں ملتا ہے جو عام فہم زبان میں "ادبیاتِ عالیہ" کہلاتا ہے، یہاں ہمیں شیکسپیئر، فردوسی اور غالب کی تخلیقات نظر آتی ہیں۔ ان تخلیقات کا پایہ بہت بلند ہے مگر ان کو بھی عوامی ادب کا مرہونِ منت ہونا پڑتا ہے۔ ٹیگور کہتے ہیں کہ

"ادب ایک لغو اور مہمل چیز ہے اگر انسان اس کا مرکزی کردار نہ ہو۔ یہی تو ایک راز ہے جو مجھ میں تجلیاتِ الٰہی کی طرح موجود ہے اور یہ لافانی ہے۔"

ایک ادیب یا شاعر اپنے زمانے کی پیداوار ہے، شاہ صاحب کا عہد برصغیر میں افراتفری والا عہد تھا۔ سندھ میں زور آزمائی کی جنگیں چل رہی تھیں، چنانچہ ہر کامل فن کار صرف اہم باتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور غیر اہم کو چھوڑ دیتا ہے۔ شاہ صاحب نے بھی یہی کیا۔ انھوں نے مقامی وڈیروں کی ہاؤ ہو کی طرف دھیان نہیں دیا اور غیر معروف شخصیتوں کو نظر انداز کر دیا، لیکن انھوں نے انگریزوں اور پرتگالیوں کے استحصال کو پہلے سے بھانپ لیا تھا، یہ لوگ ہمارے

ملک کے سیاسی اور اقتصادی زندگی پر اثر انداز ہو رہے تھے اور آنے والے زمانے میں ہم کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے تھے چنانچہ وہ بول اُٹھے کہ

"کہاں ہیں ہمارے کشتی کھینے والے ؟ دیکھو بدلیسیوں نے بھیس بدل کر گھسنا شروع کر دیا ہے۔ ہے کوئی ناخدا ؟ جو اس طوفان کا رُخ موڑ دے"

بھلا آج کتنے لوگ ہیں جو استحصال کرنے والوں کو دیکھ سکتے ہوں جیسا کہ شاہ صاحب نے دو سو سال قبل دیکھا تھا !

قرونِ وسطیٰ میں جاگیرداری کے خلاف تصوف ایک باغیانہ تحریک تھی۔ اس زمانے میں تمام تحریکوں پر مذہبی لبادہ ڈال دیا جاتا تھا۔ چنانچہ تصوف بھی ایسا ہی ایک لبادہ تھا۔ بھگتی تحریک اور یوروپ میں تصوف دونوں دوش بدوش چلنے والی مذہبی تحریکیں تھیں۔ اگر ان پر سے مذہب کا ظاہری لبادہ اتار لیا جائے تو وہ حکومتِ وقت یعنی افسر شاہی اور مذہبی پیشواؤں کے خلاف سازشیں معلوم ہوتی ہیں۔ افسر شاہی نے اور مذہبی پیشواؤں نے ایک جانب خالق و مخلوق میں رکاوٹ کھڑی کر دی تھی تو دوسری جانب حاکم و محکوم کے درمیان روڑے اٹکا دیئے تھے۔ اسی سبب سے حکامِ وقت نے اور حامیانِ مذہب نے صوفیوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا تھا۔

صوفی کی نگاہ میں انسان خلقت کا ایک مرکزی نقطہ ہے، وہ سمجھتا ہے کہ احترامِ آدمیت سے حق شناسی اور معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

شاہ لطیف کے عہد تک مادی اور سماجی ترقی اس حد تک نہیں پہنچی تھی کہ وہاں جا کر، مساواتِ انسانی کا خیال واضح طور پر اُجاگر ہو جائے۔ اسی وجہ سے صوفی شعراء نے مساواتِ انسانی کی تلقین توحیدِ الٰہی سے کی۔

شاہ کی شاعری میں تصوف کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے درباری زندگی سے پرے رہ کر اپنے لیے ایک نئی راہ ڈھونڈ نکالی تھی جو ان کی عظمت کا بیّن ثبوت ہے۔ اُن کا کردار اور ان کی شخصیت ادب اور سماج دونوں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے اصولوں کو کبھی قربان ہونے نہیں دیا اور کانٹوں کے فرش پر اپنی زندگی کی آرائش کی۔ اس

طریقے سے انھوں نے مُساوات کی دُھن کو محبت کے نغموں کے ساتھ خوب الاپا۔ وہ کہتے ہیں :۔

"اچھائیوں کو اپنی شخصیت میں جذب کرلو۔تب عاشق و معشوق
یا حبیب و محبوب میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ہم اپنی کوتاہ نظری
سے دیکھ نہ سکے ورنہ وہ تو خالق و مخلوق دونوں ہے۔"

بقول شاہ صاحب نورِ الٰہی ہر جا جلوہ گر ہے۔ ذات پات، نسل اور عقیدہ کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ 'من و تو' سے تو توحیدِ ایزدی کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔

جتنی شکلوں میں محبوب نظر آتا ہے اتنی ہی شکلوں میں عشق بھی جلوہ نمائی کرتا ہے۔شاہ صاحب کی نظروں میں عشق کی دو شکلیں ہیں، ایک تخلیقی اور دُوسری تملیکی۔ سندھ کی قدیم روایتی داستان "سسّی اور پنّوں" تخلیقی ہے۔ سسّی زندگی کی تمام آسائشوں کو چھوڑ کر پنّوں کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹکتی ہے۔لیکن خودغرضی اور خود افادیت کے جذبہ نے سسّی کی محبّت کو داغدار بنادیا ہے۔شاہ صاحب فرماتے ہیں :۔

جو سمندر میں سفر کرے
اسے پیاس کیونکر لگے
پنّو تو شاہ رگ سے زیادہ قریب ہے
سسّی ! اُسے جنگل میں کیوں ڈھونڈتی ہے ؟

عشق کی تحقیر نہیں ہوسکتی، وہ تو از خود بالقوۃ ہے۔اگر اس کی تخلیقی طاقت معطل کردی جائے تو وہ ایک تخریبی طاقت ہوجاتا ہے۔ ایلیاڈ اور رامائن شہرۂ آفاق رزمیہ کلام ہیں - لیکن وہ عشق کی تخریبی طاقت کے نمونے ہیں - ان داستانوں نے قوموں کو غرق کردیا - شاہ صاحب اس خطرناک پہلو سے بہت باخبر ہیں -چنانچہ "سسّی پنّوں" میں وہ عشق کو تخلیقی طاقت بنانے کی تلقین فرماتے ہیں -

شاہ صاحب کے رسالے میں اور بھی بہت سے رُومانوی افسانے ہیں، جن میں انھوں نے تصوف کو نغموں سے ہم آہنگ کیا ہے -

داستانِ "عُمر ماروی" ایک تملیکی عشق کی مثال ہے -عُمر ایک با اختیار سردار ہے - وہ

ملیر کی ایک دیہاتی لڑکی سے عشق کرتا ہے اور اسے ایک قلعے میں بند کردیتا ہے۔ یہ لڑکی جس کا نام ماروی ہے، ایک مفلس گھرانے میں پیدا ہوئی ہے لیکن طاقت اور دولت سے بالکل بے نیاز ہوکر قید و بند کی صعوبتوں کو جھیلتی ہے۔ وہ کہتی ہے :

مجھے چاروں طرف سے جکڑ دیا ہے
میرا قیدخانہ مقفل ہے
جاسوس ہر قدم پر کھڑے ہیں
پیارے ماروی ! میں تجھے کیسے بتاؤں ؟
میرا سینا اجیرن ہوگیا ہے۔

اُسے اپنے وطن کی یاد ستاتی ہے تو کہتی ہے :

میری نظریں اپنے دیس کی طرف لگی ہوئی ہیں
میری لاش کو میرے عزیز و اقارب کے حوالے کردینا
دمِ واپسیں سے پہلے
مجھے ملیر لے چلو
عمر ! مجھے ماروی کے پہلو میں اپنے دیس کی ٹھنڈی چھاؤں میں دفن کرنا

ماروی سندھ کی سرزمین میں محبت اور غیرت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اہلِ سندھ ماروی کے ساتھ ہم نوا ہوکر اُسی کے مانند اپنے حقوق طلب کرتے ہیں۔ ماروی حریت اور آزادی کی بھی نمائندہ ہے۔ وہ ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتی ہے، اس کی آواز نے سارے کائنات میں لرزہ پیدا کردیا ہے۔ وہ صنفِ نازک کی آزادی کی علم بردار بھی ہے۔ وہ ان تمام باتوں کی نہ صرف سندھ میں نمائندگی کرتی ہے بلکہ عالم کے ہر گوشے میں وہ مظلوم عورت کی حمایت کرتی ہے۔ ماروی اس وقت تک زندہ جاوید رہے گی جب تک کہ آزادی کے لیے انسان کی جدوجہد باقی ہے۔ وہ ایک برگزیدہ ہستی ہے جسے کوئی ناپاک ہاتھ چھو نہیں سکتا۔

لینن نے لکھا ہے کہ ٹالسٹائی وہی زبان بولتا تھا جو لاتعداد روسیوں کی زبان تھی۔ گرچہ یہ روسی لوگ اپنے حکمران طبقے سے نفرت کرتے تھے اور انھیں اس طبقے کی مخالفت میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی، کیونکہ نہ تو وہ مسلسل کوشش کرتے تھے اور نہ ان کے پاس کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ یہ تو شاہ صاحب